© rasailojaraid.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

روس کے سابق ڈکٹیٹر سٹالن کی صاحبزادی سونیلانا نے اپنے آبائی وطن روس اور اپنے بچوں کو خیرباد کہتے ہوتے اخبارات میں بعض ایسے خیالات کا اظہار کیا ہے جو واقعیت اور دلسوزی کا مرقع ہیں۔ ممکن ہے کہ بعض لوگ انہیں محض پروپگنڈا کہہ کر نظر انداز کر دیں۔ لیکن ان خیالات کی نوعیت دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کوئی آن ہونے احساسات نہیں بلکہ انسان کے فطری جذبات ہیں۔

سونیلانا نے اخبار نویسوں کو ایک سوال کا جواب دیتے ہوتے کہا کہ میرے ترکِ وطن کا سب سے اہم سبب مذہب ہے۔ میں نے ایک ایسے ملحد اور خدانا شناس گھرانے میں آنکھیں کھولیں اور پرورش پائی جہاں خدا کا کبھی بھولے سے بھی نام نہ لیا جاتا تھا۔ لیکن جب میں سنِ شعور کو پہنچی تو مجھے خودبخود بغیر کسی خارجی تحریک یا ترغیب کے یہ احساس ہونے لگا کہ خدائے لم یزل پر ایمان لاتے بغیر نہ تو زندگی، زندگی کہلانے کی مستحق ہے اور نہ انسان اور انسان کے مابین عدل و انصاف کا قیام ممکن ہے۔ میں مذہب کو انسان کے لیے اتنا ہی اہم اور ضروری سمجھتی ہوں جتنا کہ ہوا اور پانی۔

اس نے کہا کہ انسانوں کو باہم ایک دوسرے سے الجھنے اور ایک دوسرے کا خون بہانے کے بجائے مل جل کر نسلِ انسانی کی فلاح و بہبود کے لیے تگ و دو کرنی چاہیے۔ اس معاملے میں اساتذہ، سائنس دانوں، علمائے مذہب، اطبّا اور قانون دانوں کے درمیان مملکت کی تنگ حدود سے نکل کر یا سیاسی تعصبات سے آزاد ہو کر اشتراکِ عمل ہونا چاہیے۔

ئه یہ امر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ سونیلانہ کا لفظی ترجمہ "نورجہان" ہے۔ شاید اسٹالن کو ملکہ نورجہاں کا نام پسند آیا اور اس نے اسی کا ترجمہ کرکے اپنی بچی کا نام رکھ دیا۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

میرے نزدیک سرمایہ داروں یا اشتراکیوں کے مابین ہر قسم کی مصنوعی تفریق غلط ہے۔ انسانوں کے دو ہی درجے ہیں۔ نیک اور بھلے انسان، یا بُرے اور شریر انسان۔ دیانت دار اور مخلص انسان، یا بد دیانت اور دھوکے باز انسان۔ شریف اور مخلص لوگ جس ملک سے بھی تعلق رکھتے ہوں اُن کے اخلاق اور مزاج میں بہت حد تک ہم آہنگی پائی جاتی ہے اور اُن کے عزائم اور ارادے بھی قریب قریب ایک جیسے ہی ہوتے ہیں۔ ... میری حکومت مجھے مملکت یا ریاست کی ملکیت سمجھتے ہوئے میرے نکاح کے معاملے میں حارج رہی۔ مجھے اور میرے خاوند کو اکٹھے سفر کرنے کی بھی اجازت نہ دی گئی۔ اس کی وفات کے بعد میرے برسوں کے دبے ہوئے جذبات میں تلاطم پیدا ہُوا اور وہ ابھر کر آپ سب کے سامنے آگئے ہیں۔

سوتیلانا نے خدا، مذہب اور ضمیر کی آزادی کے بارے میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے وہ کوئی ایسی باتیں نہیں جو پہلی مرتبہ دنیا کے سامنے آئی ہوں۔ یہ خیالات انسانی فطرت کے بنیادی حقائق ہیں جن سے انسان بحیثیت انسان آج تک کبھی صرفِ نظر نہیں کر سکا۔ حیاتِ انسانی میں ان حقائق سے زیادہ کوئی چیز وزن دار اور مسلّم نہیں۔ انسان ان حقائق کو اپنے قریب ترین رشتوں سے زیادہ پہچانتا ہے۔ اُس کی فطرت قدم قدم پر ان کے صحیح اور برحق ہونے پر گواہی دیتی ہے۔ اس کا دل انہیں ماننے اور تسلیم کرنے میں سکون و اطمینان اور ان کے انکار میں اضطراب محسوس کرتا ہے۔ اس کا دماغ ان کے وجود سے کبھی ایک لمحہ کے لیے بھی خالی نہیں ہوتا۔

آپ سب سے پہلے ہستی باری تعالیٰ کو ہی لیجیے۔ ایک ایسی طاقتور، ہمہ گیر صاحب ارادہ اور علیم و خبیر ہستی جس نے اس کائنات کو ایک خاص نظم کے ساتھ پیدا کیا اور پھر اسے ایک خاص تدبیر کے ساتھ چلانے کا انتظام فرمایا، اس پر ایمان اور اعتقاد انسان کی فطرت میں داخل ہے۔ جس شخص نے کبھی خدا کا نام تک نہ سنا ہو، اُس کے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

دل میں بھی

دیکھے بھالے بن سوجھے

جانے پہچانے، بن بوجھے

وجود کا احساس ہمیشہ موجود رہتا ہے۔ اس احساس کے مظاہر مختلف ہو سکتے ہیں۔ کبھی یہ کسی شخص کے اندر ایک ہلکی سی لَے کی طرح ارتعاش پیدا کرتا ہے۔ کبھی یہ زلزلہ اور طوفان بن کر انسان کی پوری زندگی کو زیروزبر کردیتا ہے۔ کبھی یہ کسی شخص کے دل میں اس خاموشی کے ساتھ رہتا ہے کہ اسے اس کی گہرائی یا سطحیت کا شعور تک نہیں ہوتا، لیکن اس کا وجود ہر حال میں موجود ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید نے بڑی حیرت واستعجاب کے انداز میں فرمایا ہے:

اَفِی اللّٰہِ شَکٌّ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (ابراہیم: ۱۰)

کیا تمھیں اُس اللہ کی ہستی میں شک ہے جو تمام آسمان وزمین (اور اُن کی ساری کائنات) کی بنانے والی ہے؟ یعنی ایسی معروف ذات جو انسان کی شاہ رگ سے بھی زیادہ اس کے قریب ہے اُس کے بارے میں آخر کس طرح شک کیا جاسکتا ہے؟ خدا کا وجود کوئی متنازع فیہ مسئلہ ہی نہیں ہے بلکہ زندگی کی سب سے بڑی حقیقت ہے۔ اس لیے کوئی شخص ہوش وحواس رکھتے ہوئے اسے ماننے میں کوئی تردد محسوس نہیں کرسکتا۔

مَنْ عَرَفَ نَفْسَہٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّہٗ ایک مشہور مقولہ ہے۔ انسان کا وجود، اس کی فکری وذہنی صلاحیتیں، اُس کے فطری داعیات، سب باری تعالیٰ کے وجود پر دلالت کرتے ہیں۔ انسان جب اپنے جسم پر غور کرتا ہے تو وہ اُسے صنعت وکاریگری کا نہایت عجیب وغریب نمونہ پاتا ہے۔ اپنے آپ سے ہٹ کر وہ جب کائنات پر ایک نگاہ ڈالتا ہے تو وہ یہ دیکھتا ہے کہ یہاں ریت کے معمولی ذرّوں یا پانی کی چند بوندوں سے لے کر سربفلک پہاڑوں اور تلاطم خیز سمندروں تک سب ایک زبردست اور قادرِمطلق صانع کے وجود کی شہادت دے رہے ہیں۔ اسی حقیقت کی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

طرف قرآن مجید نے ان الفاظ میں اشارہ فرمایا ہے:

وَفِي الْأَرْضِ آيَاتٌ لِّلْمُوقِنِينَ وَفِي أَنفُسِكُمْ ۚ أَفَلَا تُبْصِرُونَ - (ذاریات ۲۰-۲۱)

"اور یقین کرنے والوں کے لیے زمین میں، اور خود تمہارے وجود میں بہت سی نشانیاں ہیں۔
پھر کیا تمہیں دکھائی نہیں دیتا؟"

حقیقت یہ ہے کہ فطرت کے رنگا رنگ مظاہر نے انسان کے اندر ایمانی کیفیت پیدا کرنے میں ہمیشہ نہایت ہی اہم کردار ادا کیا ہے۔ انسان نے ہمیشہ فطرت کے جمال میں حسن ازل کی جھلک دیکھی ہے۔ پہاڑوں اور جنگلوں کی خاموش گویائی نے پکار پکار کر اسے ایک ان دیکھی ذات پر ایمان لانے کی دعوت دی ہے۔ سورج کی خشمگیں کرنوں میں چاند کی ٹھنڈک میں، صبح کی صباحت اور شام کی ملاحت میں اس نے آیات الٰہی کا مشاہدہ کیا ہے۔

بعض اوقات یہ کہا جاتا ہے کہ مناظر قدرت ہمیشہ اچھے احساسات ہی پیدا نہیں کرتے بلکہ خوف کے جذبات کو بھی جنم دیتے ہیں۔ یہ بات بالکل صحیح اور درست ہے۔ لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ ایمان ایجابی اور سلبی دونوں کیفیات کا نام ہے۔ وہ اگر ایک طرف انسان کے دل میں باری تعالیٰ کی بے پایاں رحمتوں کا احساس پیدا کرتا ہے تو دوسری طرف اس کے اندر شر اور بدی کے خیالات کو دبانے اور برائی سے باز رکھنے کے لیے اسے عقوبت الٰہی سے بھی ڈراتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انسان اپنے اندر قدرت کے حسین و جمیل مناظر سے رحمت خداوندی کا احساس کرتا ہے اور اپنے دل کی دنیا کو رجائیت سے معمور کرتا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ قدرت کے ہیبتناک مظاہر کو دیکھ کر اس کے دل میں خوف الٰہی بھی طاری ہو جاتا ہے۔

اس موقع پر میں اس فلسفیانہ بحث میں نہیں پڑنا چاہتا کہ سلبی اخلاق یعنی وہ نیکی جو صرف سزا اور عذاب کے خوف سے کی جائے اور وہ اطاعت جس کا محرک ڈر ہو وہ کس حد تک معیاری نیکی کہلانے کی مستحق ہے۔ لیکن بطور جملہ معترضہ اتنا عرض کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ محبت الٰہی اور خشیت الٰہی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

دونوں ایمانی کیفیات پیدا کرنے کے لیے یکساں ضروری ہیں۔

مظاہر قدرت سے خالق کے وجود کا پتہ چلتا ہے۔ مگر جب ہم اس کائنات پر غور و فکر کرتے ہوئے یہ دیکھتے ہیں کہ اس کائنات کے مختلف شعبوں اور گوشوں کے درمیان ایک معنوی ربط اور مقصدی ترتیب پائی جاتی ہے تو ہمارے سامنے صفاتِ الٰہی جلوہ گر ہوتی ہیں۔ ہم خالق کی تخلیق میں حیرت انگیز توازن اور ہم آہنگی دیکھ کر اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ یہ کائنات اور اس کا سارا کارخانہ کسی اندھی بہری قوت کی کارفرمائی کا نتیجہ نہیں ہیں بلکہ کوئی صاحب تدبیر ہستی پوری حکمت و دانائی کے ساتھ اسے ایک خاص مقصد کے تحت چلا رہی ہے۔ اس کی تخلیق بھی حیرت انگیز ہے اور اس کی تدبیر بھی حیرت انگیز۔ انسان اسے دیکھ کر اس حقیقت کو تسلیم کرنے پر اپنے آپ کو مجبور پاتا ہے کہ یہ کسی ایسی طاقتور، علیم و خبیر اور صاحبِ تدبیر ہستی کی کرشمہ سازی ہے جس کے قبضۂ قدرت سے کوئی معمولی سے معمولی چیز اور کوئی بڑی سے بڑی چیز باہر نہیں ہو سکتی۔

نفس کی پہچان سے معرفتِ الٰہی دو طرح سے حاصل ہوتی ہے۔ ایک تو انسان کے اپنی جسمانی ساخت پر غور کرنے سے۔ اور دوسرے اپنی قلبی کیفیات اور واردات کا جائزہ لینے سے۔ جس طرح مظاہر قدرت خالق کے وجود کی شہادت دیتے ہیں بالکل اسی طرح انسان جو صانع کائنات کی کاریگری کا نہایت اعلیٰ و ارفع نمونہ ہے، وہ اس کی بے مثال صناعی کی عکاسی کرتا ہے۔ مگر ان خارجی مظاہر سے ہٹ کر جب ہم انسان کی داخلی کیفیات پر غور کرتے ہیں تو وہاں بھی ہمیں قدم قدم پر قادر مطلق کے وجود کی شہادت فراہم ہوتی ہے۔

اتنی بات تو ہر شخص جانتا ہے کہ ہماری ہر شعوری کیفیت کے لیے ایک معروض کا ہونا ضروری ہے۔ اگر غصہ آئے گا تو کسی بات یا شخص پر۔ محبت کے جذبات ابھریں گے تو کسی ذات یا عقیدے اور نصب العین کے لیے۔ اگر خوشی اور مسرت کی لہریں اٹھیں گی تو کس چیز یا خیال پر۔ اگر احترام

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اور عقیدت پیدا ہوگی تو کسی شخص، گروہ یا نظریے کے لیے۔ غرض ہر نفسی کیفیت کے لیے ایک معروض ہونا ناگزیر ہے۔ یہ معروضات ضروری نہیں کہ محسوس اشیاء ہی ہوں۔ یہ پیکر محسوس بھی ہو سکتے ہیں اور خیالات و تصورات بھی۔ بلکہ اکثر صورتوں میں دیکھا گیا ہے کہ خیالات و تصورات سے انسان کے دل کی دنیا جتنی زیر و زبر ہوتی ہے اتنی محسوسات سے نہیں ہوتی۔ غلطی کا احساس جتنی زیادہ ندامت پیدا کرتا ہے خود گناہ کا ارتکاب کرتے وقت اتنا شدید احساس پیدا نہیں ہوتا۔ دل شکن اور تلخ بات خود اتنی زیادہ ناگوار محسوس نہیں ہوتی جتنی کہ تھوڑی دیر بعد اس کی یاد۔ اب اگر بھوک کا احساس اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ کوئی چیز ایسی موجود ہے جس سے بھوک مٹائی جا سکتی ہے۔ یا محبت کا احساس اس بات کی شہادت فراہم کرتا ہے کہ کوئی ذات، عقیدہ یا نظریہ ایسا ہے جو اس کے جذبہ محبت کی تسکین کر سکتا ہے، تو آخر اس حقیقت کو تسلیم کرنے میں کونسی چیز مانع ہے کہ انسان کے اندر جب یہ فطری احساس پایا جاتا ہے کہ اس عالم مجاز و محسوسات سے بالاتر، ہمارے نظام کائنات سے ارفع و اعلیٰ ایک ان دیکھا نظام موجود ہے، تو اس کی تہ میں بھی کچھ ان دیکھے حقائق کا وجود ناگزیر ہے۔ جب ہم ہر شعوری کیفیت کے لیے ایک معروض کے وجود کو ضروری سمجھتے ہیں تو آخر مذہبی احساس کے لیے کسی معروض کو کیوں ضروری نہیں سمجھتے! اس معروض کا وجود دوسرے تمام معروضات سے کہیں زیادہ اہم ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ حسّی کیفیات ہر وقت پیدا نہیں ہوتیں۔ مثلاً ہمیں بھوک مٹانے اور پیاس بجھانے والی اشیاء کا خیال اُس وقت آتا ہے جب ہمیں اس کے لیے تحریک ہو۔ مگر مذہبی احساس سے ہم ایک لمحہ کے لیے بھی بے نیاز نہیں رہ سکتے کیونکہ ہم کوئی خیال دل میں لاتے ہوئے یا کوئی عمل کرتے ہوئے یہ بات سوچنے پر اپنے آپ کو مجبور پاتے ہیں کہ یہ خیال یا فعل عالم محسوسات سے ماوراء ان دیکھے نظام سے مطابقت رکھتا ہے یا نہیں۔

جس طرح ہمارے حسّی داعیات مادّی اشیاء کے حصول سے تسکین پاتے ہیں بالکل اسی طرح ہمارا حاسّۂ مذہبی، جو ان داعیات سے کہیں زیادہ انسانی فطرت کا لازمی عنصر ہے، کسی ذات میں الوہیت

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کی شان دیکھ کر اطمینان پاتا ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ جس ہستی میں وہ الوہیت کی شان دیکھتا ہے وہ فی الحقیقت اس کی اہل بھی ہو۔ وہ بسا اوقات اپنی حماقت یا بے بصری سے اُس کو اُن ہستیوں یا محسوس اور غیر محسوس پیکروں میں تلاش کرتا ہے جو اس سے کسی حالت میں بھی مشرف نہیں ہو سکتے۔ مگر اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ الوہیت کی شان دیکھے بغیر اور اس کے ساتھ رشتۂ عبودیت قائم کیے بغیر زندگی کا خلا پُر نہیں ہوتا۔ انسان کو اپنا نظامِ تنفّس قائم رکھنے اور اپنی بقا کے لیے پاکیزہ ہوا کی ضرورت رہتی ہے لیکن اگر پاکیزہ ہوا میسر نہ ہو تو وہ خلا میں زندہ نہیں رہ سکتا بلکہ اس ضرورت کو وہ کثیف ہوا ہی سے پورا کر کے سانس کے رشتہ کو ہر حال میں قائم رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ بالکل اسی طرح اگر ایک فرد اُس قادرِ مطلق خدا کی معرفت تک نہیں پہنچا جس کی ذات اُلوہیت کا بلا شرکتِ غیر استحقاق رکھتی ہے تو اس کا مذہبی احساس اپنی تسکین کے لیے کچھ جھوٹے الٰہ بنا کر اُن کی بندگی اختیار کر کے اپنے اس مذہبی اور روحانی خلا کو پُر کرتا ہے۔

جس طرح سانس اور زندگی کو ایک دوسرے سے الگ کرنا ناممکن ہے بالکل اسی طرح انسان کو احساسِ بندگی سے جُدا نہیں رکھا جا سکتا۔ یہ بات انسان کی سرشت میں داخل ہے کہ وہ کسی الٰہ کے ساتھ رشتۂ عبودیت استوار کرے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ انسان نے مختلف اوقات میں مختلف ہستیوں یا مختلف اشیاء کو الٰہ بنایا لیکن اُس نے اپنے حاسّۂ مذہبی کی تسکین کے لیے کبھی بھی ان ہستیوں یا چیزوں کی طرف اُن کی اصل کے اعتبار سے رجوع نہیں کیا۔ اس کی رُوح ان کے اندر الوہیت تلاش کر کے اطمینان کا سامان فراہم کرنے کی کوشش کرتی رہی۔ انسان کبھی درختوں اور پتھروں کے سامنے سربسجود ہوا، کبھی پہاڑوں، دریاؤں اور سمندروں کے سامنے جبینِ نیاز جھکائی، اور دورِ جدید میں ملک، قوم، وطن، معاشرے اور ریاست کو خدا بنا کر اُس کی پرستش شروع کی۔ لیکن ان جھوٹے خداؤں کے پرستاروں کی اگر ذہنی کیفیت کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ وہ ان میں سے کسی ہستی، چیز یا ادارے کو بجائے خود الٰہ تسلیم کرنے پر تیار نہیں ہوتے بلکہ انہیں مظاہرِ اُلوہیت سمجھ کر ان کی بندگی اختیار کرتے ہیں۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مذہب اور فلسفۂ مذہب کے مغربی ماہرین کو اس باب میں سخت غلطیاں لاحق ہوئی ہیں اور انہوں نے حاسہ مذہبی کی صحیح نوعیت کو نہ سمجھنے کی وجہ سے عجیب و غریب ٹھوکریں کھائی ہیں۔ انہوں نے غلطی سے یہ سمجھ لیا ہے کہ یہ حاسّۂ مذہبی کوئی الگ احساس نہیں بلکہ انسان کے حسّی داعیات کا ہی حصہ ہے۔ چنانچہ انہوں نے اپنے موقف کی حمایت میں یہ دلیل دی کہ انسان جب اشیاء یا شخصیتوں سے مستفید ہونے کی توقع رکھتا یا اُن سے خوف محسوس کرتا ہے تو انہیں خدا بنا لیتا ہے۔ فائدے کی توقع اور نقصان کے اندیشے سے کبھی کسی چیز یا ذات میں شانِ اُلوہیت پیدا نہیں ہوتی۔ اس سے انسان کے اندر مفید اشیاء کے حصول کی خواہش اور مضرت رساں اشیاء سے بچنے کی تمنا پیدا ہوتی ہے۔ اُلوہیت اس سے بالکل مختلف چیز ہے۔ یہ ایک ایسی صفت ہے جس سے انسان کے حاسّۂ مذہبی کی تسکین ہوتی ہے اور جس ذات میں وہ اسے جلوہ گر پاتا ہے اُس کے سامنے سرِ عجز و نیاز جھکا کر اپنی روح کو پوری کائنات اور اس کے خالق کے ساتھ ہم آہنگ محسوس کرتے ہوئے اسے تسکین پہنچاتا ہے۔ چنانچہ دیکھیے کہ خود اُن مذاہب میں بھی جو "پیکرِ محسوس" کی پرستش کرتے ہیں یہ پیکر محض ضمنی اور ثانوی حیثیت رکھتے ہیں اور انسان ان کی مدد سے اُلوہیت کے اُس منبع تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے جہاں سے اُس کی روحانی پیاس بجھ سکتی ہے۔ آخر کیا وجہ ہے کہ وہ اپنی توجہ صرف اِن پیکرانِ محسوس تک ہی محدود نہیں رکھتا بلکہ ان سے گزر کر فوراً صفاتِ الٰہی کے تصوّرات تک پہنچ جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ پیکرِ محسوس وہ ایمانی کیفیت پیدا نہیں کر سکتا جس کا انسان کی فطرت تقاضا کرتی ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ خود یہ ایمانی کیفیت کیا ہے جس کے تحت انسان اَن دیکھی حقیقت کو محسوس و مشہود حقیقت سے زیادہ یقین کے ساتھ مانتا اور اُس سے زیادہ شدت کے ساتھ محسوس کرتا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ایمانی کیفیت درحقیقت ایک ایسا اثیت فطری جذبہ ہے جس کے زیرِ اثر محدود لامحدود کی معرفت حاصل کر کے، اس کی تصدیق کرتا ہے اور پھر اپنی زندگی کو اُس کے منشا اور مرضی کے مطابق ڈھالنے کے لیے کوشاں ہوتا ہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں اہلِ ایمان کو صدیق

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کہا گیا ہے :

وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰہِ وَرُسُلِہٖٓ اور جو لوگ خدا اور اس کے انبیاء پر ایمان لائے

اُولٰٓئِکَ ھُمُ الصِّدِّیْقُوْنَ ۔ (الحدید ۔ ۱۹) وہی صدیق ہیں ۔

پھر قرآن مجید نے ہمیں یہ بھی بتایا ہے کہ ایمان ایک ایسی قلبی کیفیت کا نام ہے جس سے انسان کو یقین کے ساتھ طمانیت کی دولت بھی حاصل ہو، کیونکہ انسان کا یقین اُس وقت تک پختہ نہیں ہوتا جب تک اُس کا دل کسی حقیقت پر مطمئن نہ ہو جائے ۔

معاملہ پھر انہیں دو جذبات پر ختم نہیں ہوتا بلکہ جب انسان کے دل میں یقین پوری طرح راسخ ہو جاتا ہے اور انسان کو اپنے عقیدے پر پوری طمانیت حاصل ہو جاتی ہے تو پھر وہ بندگی کے دوسرے لوازم پورے کرتا ہے ۔ انسان کسی ذات یا ادارے کو اس وقت تک الٰہ بنا کر اپنے حاسۂ مذہبی کی تسکین نہیں کر سکتا جب تک وہ الوہیت کے سارے تقاضے پورے نہ کرے ۔ اور اسے انسان کی خوش بختی کے علاوہ اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ سوائے ذات باری تعالیٰ کے کوئی دوسری ہستی ایسی نہیں جو اس اعتبار سے انسان کو مکمل سکون اور اطمینان مہیا کر سکے ۔ خالقِ کائنات کے سوا انسان جتنے جھوٹے الٰہ بنا کر ان کی پرستش کریگا اتنا ہی وہ مذہب اور روحانیت کے شیریں عنصر سے محروم رہے گا ۔

لفظ الٰہ کے مختلف مشتقات کا جو ذکر ائمۂ لغت نے کیا ہے انہیں دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ اُس ذاتِ برحق کے سوا کوئی دوسری ذات اس کی سزاوار نہیں ہو سکتی ۔ انسان اگر کسی غلط فہمی میں مبتلا ہو کر دوسروں کو بطور الٰہ مان بھی لے تو اُس کی رُوح کبھی مطمئن نہیں ہو سکتی اور وہ اسی طرح اضطراب محسوس کرتی ہے جس طرح کہ سوتیلانا نے اشتراکیت کی خدائی کے اندر رہتے ہوئے محسوس کیا ۔ ہم یہاں بطور مثال لفظ اللہ کے چند مشتقات نقل کرتے ہیں ۔

بعض ائمۂ نحو کا خیال ہے کہ یہ لفظ الٰہ بمعنی تحیّر سے مشتق ہے ۔ باری تعالیٰ کی ذات اور اس کی صفات کے ادراک سے چونکہ عقل عاجز ہے اس لیے اُسے اللہ کہا گیا ہے ۔ یہ انسان کی اللہ تعالیٰ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کے معاملے میں اسی بے بسی اور درماندگی کا نتیجہ ہے کہ اس کے اندر انکسار اور فروتنی پیدا ہوتی ہے اور اس کا دل رشد و ہدایت کے اُس نظام کی تلاش کرتا ہے جس کا منبع و مصدر محدود عقل کے خام تجربات نہیں بلکہ وہ سلسلہ وحی و الہام ہے جو ہر خطا سے پاک اور منزہ ہونے کی بنا پر ہر لحاظ سے قابلِ اعتماد ہے۔

بعض دوسرے ائمہ نے یہ کہا ہے کہ لفظ الٰہ اصل میں ولاہ ہے۔ واؤ کو ہمزہ سے بدل کر الٰہ بنا لیا گیا اور اس طرح ولہ کے معنی ہوئے عشق و محبت میں وارفتہ اور بےخود۔ چونکہ ذات باری تعالیٰ سے مخلوق کو والہانہ محبت و عقیدت ہوتی ہے اس لیے اُسے اللہ کہہ دیا۔ ایمانی کیفیت کے لیے معبود سے بے انتہا محبت ـــ ایک ایسی محبت جو دوسرے سارے علائق اور رشتوں پر غالب ہو ـــ لازمی شرط ہے۔ کسی ذات کی الوہیت تسلیم کرنے کے معنی ہی یہی ہیں کہ آدمی اُس ذات کی خوشنودی کے لیے جیے اُسی کے منشا کو پورا کرنے کے لیے مرے۔ اُس ذات سے زیادہ اُسے کوئی ہستی یا چیز عزیز تر نہ ہو۔

الوہیت کی صحیح طور پر مستحق وہی ذات ہو سکتی ہے جو زمان و مکان کی حدبندیوں سے آزاد اور عالمِ محسوسات سے ماورا ہو۔ کیونکہ محسوس اشیا کبھی بھی استغراق اور دھیان کا موضوع نہیں بن سکتیں جو ذات غیب اور مستور ہو اس کے ساتھ روحانی تعلق پیدا کر کے ہی انسان مذہبی احساس کی تسکین حاصل کرتا ہے۔ چنانچہ دیکھیے کہ جن لوگوں نے بھی پیکرِ محسوس کو الوہیت کا مظہر سمجھا انہوں نے بھی اُس ذات میں روحانی اور مذہبی استغراق پیدا کرنے کے لیے اپنی زیادہ تر توجہ صفاتِ الوہیت یا الوہیت کے مجرد تصورات پر مرکوز رکھی۔ کیونکہ ان کے بغیر استغراق کی کیفیت کا پیدا ہونا بالکل ناممکن ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ سطح بین آنکھیں بسا اوقات لباسِ مجاز میں اُلجھ کر رہ جاتی ہیں، مگر انسان کی فطرت نے ہمیشہ اس کیفیت پر اضطراب محسوس کیا ہے اور اس کے دلِ بیتاب نے پسِ پردہ جھانک کر اُس حقیقتِ کبریٰ کا کھوج لگانے کی کوشش کی ہے جو اس لباسِ مجاز میں جلوہ گر ہے۔

اہلِ مغرب اور خصوصاً اشتراکیت کے علمبرداروں کو ماورائے حسی حقائق کے ابطال پر بڑا ناز ہے لیکن یہ عجیب بات ہے کہ جن اشیاء یا اداروں کو انہوں نے اپنا الٰہ بنایا ہے انہیں وہ مستور اور

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

غیب ہی سمجھتے ہیں اور اُن کے بارے میں یہ پختہ یقین رکھتے ہیں کہ وہ محسوسات سے بالا ہیں۔ ہم یہاں بطور مثال مملکت کو لیتے ہیں۔ مملکت جو انسانی آبادی اور جغرافیائی حدود کا مجموعہ ہے وہ الوہیت کی مظہر ہے مگر وہ الٰہ نہیں۔ الٰہ اُن کے نزدیک ریاست ہے اور یہ محض ایک ایسی قوتِ قاہرہ کا تصور ہے جو ہر عیب سے پاک اور ہر کمزوری سے مبرا ہے اور جس کا ارادہ سب پر حاوی اور جس کی اطاعت سب لوگوں پر فرض ہے۔ جو عوام سے بلا شرکتِ غیرے فرمانبرداری کا مطالبہ کرنے کا حق رکھتی ہے۔

ماورائے محسوسات سے انکار کرنے والا مغربی ذہن ریاست کو صرف ایک تصور ہی سمجھتا ہے اس کی وجہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ الوہیت تک مستور نہ ہو اُس وقت تک اُس کے ساتھ وہ روحانی تعلق پیدا نہیں ہو سکتا جو مذہب کا لازمی اور ضروری جزو ہے۔ چنانچہ لفظ الٰہ کے سلسلے میں بعض اہلِ علم کا خیال یہ ہے کہ یہ لفظ لَاہَ یَلُوْہُ لِیَاھًا سے مشتق ہے اور اس کے معنی ہی ہیں پردہ میں چھپ جانا۔ چونکہ باری تعالیٰ بھی نگاہوں سے مستور و محجوب ہے اس لیے اُسے اللہ کہا جاتا ہے۔ اسی معنی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قرآن نے ارشاد فرمایا ہے:

لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ۔ (الانعام-۱۰۳) نگاہیں اس کا ادراک نہیں کر سکتیں اور وہ نگاہوں کا ادراک کرسکتا ہے۔

یعنی الوہیت کی حامل وہی ذات ہو سکتی ہے جو انسان کی نگاہ سے مستور ہو مگر انسان یہ ضرور یقین رکھتا ہو کہ وہ ذات اُسے اچھی طرح دیکھ رہی ہے اور اُس سے اُس کی کوئی بات مخفی نہیں ہے۔ اُس ذات کے غیر محسوس ہونے کی بنا پر ہی انسان کے اندر اُس کے بارے میں وہ لطیف احساسات اُبھرتے ہیں جن سے وہ اپنی روحانی پیاس بجھاتا ہے۔

ان وجوہ کی بنا پر اس حقیقت کا سمجھنا کچھ مشکل نہیں کہ خدا اور مذہب کے بارے میں سوتیلانا کے احساسات کوئی غیر فطری جذبات نہیں بلکہ اس نے جو کچھ کہا ہے وہ انسانی فطرت کا عین اقتضا ہے۔ انسان کا جاشۂ مذہبی اپنی تسکین کے لیے کسی نہ کسی الٰہ کی پرستش کے لیے اپنے آپ کو مجبور پاتا ہے اور

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

برکلے کے الفاظ میں اگر وہ ذاتِ باری کو اپنے دل میں بحیثیت معبود جگہ نہیں دیتا تو پھر شیطان کو وہاں لیا کر اُس کی پوجا کرتا ہے۔ مذہب کو اختیار کیے بغیر کوئی چارہ نہیں اور کسی الٰہ کے سامنے سرِ تسلیم خم کیے بغیر انسان رہ نہیں سکتا۔ اب یہ انسان کی خوش نصیبی یا اُس کی بدبختی ہے کہ وہ خالقِ حقیقی کی بندگی اختیار کر کے دنیا اور آخرت میں فلاح و کامرانی حاصل کرتا ہے یا باطل خداؤں کا پرستار بن کر دنیا اور عقبیٰ دونوں جگہ نامراد بنتا ہے۔

خدائے لم یزل پر ایمان نہ صرف انسانی فطرت کا لازمی جز ہے بلکہ سونتیلانہ کے الفاظ میں اُس پر ایمان لائے بغیر نہ تو زندگی صحیح معنوں میں زندگی کہلانے کی مستحق ہو سکتی ہے اور نہ انسان اور انسان کے مابین عدل و انصاف کا قیام ممکن ہے۔ اصل میں خدائے واحد پر ایمان ہی سے انسان کے اندر یہ احساس اُبھرتا ہے کہ اپنی زندگی میں منشاءِ الٰہی سے مطابقت پیدا کرے۔ یہی احساس اُسے مادّی نفع و نقصان کے خم و پیچ سے آزاد کر کے کسی اعلیٰ اور ارفع نصب العین سے لذت آشنا کرتا ہے۔ اگر انسانی عمل کے محرکات صرف مادی ہوں تو زندگی بالکل بے معنی ہو کر رہ جاتی ہے کیونکہ اس طرح انسان میکانکی طور پر مادی فوائد کے حصول کے لیے سرگرداں رہتا ہے اور اخلاقی نقطۂ نظر سے بھلے اور بُرے کے درمیان تمیز نہیں کر سکتا۔ اُس کے نزدیک بُرائی وہ ہوتی ہے جس سے مادی نقصان کا اندیشہ ہو اور اچھائی وہ جس سے مادی منافع حاصل ہوں۔ ظاہر بات ہے کہ یہ طرزِ فکر انسان کو اعلیٰ مرتبہ و مقام کی طرف لے جانے کے بجائے اُسے حیوانوں کی پست سطح پر لے جائے گا اور وہ روحانی اور اخلاقی اعتبار سے بلند ہونے کے بجائے حسّی خواہشات کا غلام بننے میں لذّت محسوس کرے گا۔ چنانچہ دیکھیے کہ جب سے انسان نے مذہبی اخلاق کو نظر انداز کر کے افادی اخلاق کو اپنانا شروع کیا ہے اُس کی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں زبردست بگاڑ پیدا ہوا ہے۔ حال میں دنیا کے سب سے زیادہ خوشحال معاشرے کا جائزہ لینے سے یہ معلوم ہوا ہے کہ ۱۹۶۵ء میں امریکہ کے اندر پولیس کے نوٹس میں صرف چوری اور سرقہ کی ۲۵ لاکھ وارداتیں لائی گئیں۔ اس تشویشناک صورتِ حال کو دیکھتے ہوئے تحقیقِ جرائم کے کمیشن نے جھنجھلاہٹ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کے عالم میں کہا کہ ان جرائم کے قلع قمع کے لیے مندرجہ ذیل صورتیں ہی ممکن ہو سکتی ہیں:

(ا) تمام بڑے بڑے شہروں کو جن کی آبادیوں کا چھٹا حصہ قاتلوں اور تیسرا حصہ ڈاکوؤں پر مشتمل ہے مسمار کر دیا جائے۔

(ب) ۱۵ اور ۱۶ سال کی عمر کے بچوں کو عام معاشرے سے الگ رکھنے کا انتظام کیا جائے کیونکہ یہی گروہ سب سے زیادہ قانون شکنی کرتا ہے۔

(ج) تمام برق رفتار سواریوں کا خاتمہ کر دیا جائے کیونکہ ایک تو یہ ۵ لاکھ کی تعداد میں ہر سال چوری کر لی جاتی ہیں۔ دوسرے بنکوں کو لوٹنے، سمگلنگ اور اسی نوعیت کے دوسرے جرائم کے لیے ان سے مدد ملتی ہے۔

(د) تمام بڑے بڑے کاروبار سمیٹ لینے چاہییں، کیونکہ دولت کے ہوس کا رویہ ناجائز کمائی کے لیے ترغیب دیتے ہیں۔

اس المناک صورتِ حال کی وجہ غربت اور افلاس نہیں بلکہ اُس داخلی نظم و ضبط کا فقدان ہے جو مذہب انسان کے اندر پیدا کرتا ہے۔ قانون کا ہاتھ تو چند جرائم کے صرف خارجی واقعات کی گرفت کر سکتا ہے مگر دل کی انجان گہرائیوں میں اُبھرنے والے معصیت آلود خیالات تو صرف اُس چشم ہمہ بین پر ایمان ہی سے دب سکتے ہیں جس کے متعلق آدمی یہ محسوس کرتا ہے کہ خواہ دنیاوی مواخذہ سے وہ کتنا محفوظ ہو مگر اُس زبردست ہاتھ سے وہ محفوظ نہیں رہ سکتا۔ انسان کو راہِ ہدایت پر قائم رکھنے کے لیے صرف فوجداری اور دیوانی قوانین ہی کافی نہیں ہیں، بلکہ کمیشن کے الفاظ میں اگر اس کے دائرے کو حکومت مسلسل پھیلاتی چلی جائے تو انسان کے لیے زندگی ناممکن ہو جائے۔ مگر روز بروز وسیع تر دائرے پر پھیلاؤ کے باوجود یہ قوانین ان کی روک تھام میں یکسر ناکام رہے ہیں کیونکہ ان جرائم کی نوعیتیں اور ان کی علتیں اتنی پیچیدہ اور اُلجھی ہوئی ہوتی ہیں کہ ان کی کثیر تعداد کے معاملے میں قانون بے بس ہوتا ہے۔ ان قوانین سے زیادہ سے زیادہ وہ اخلاق پیدا ہو سکتا ہے جسے انگریزی میں اُجالے کا اخلاق (DAY LIGHT MORALITY) کہتے ہیں۔ یعنی اگر کوئی دیکھتا نہ ہو، اگر یا خود

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہونے کا اندیشہ نہ ہو اور قانونی شکنجہ سے بچ نکلنے کا موقع ہو تو برائی کا ارتکاب کر لیا جائے ورنہ اس سے اجتناب کیا جاتا ہے۔ باقی رہا وہ اخلاق جو انسان کو خود اپنے نفس کا محاسبہ کرنے کی ترغیب دے تو وہ صرف ایمان باللہ ہی سے پیدا ہو سکتا ہے یعنی ایک سمیع و بصیر، علیم و خبیر ہستی پر ایمان لانے سے جو ہر وقت اور ہر جگہ موجود ہے اور جس کی طرف انسان کو لوٹ کر جانا ہے اور اپنے ہر عمل کا حساب پیش کرنا ہے۔

سونیلانا نے اپنے اس بیان میں ایک اور صحیح بات یہ بھی کہی ہے کہ انسان اور انسان کے درمیان اگر کوئی امتیاز کیا جا سکتا ہے تو وہ نیکی اور بھلائی کی بنیاد پر ہونا چاہیے۔ انسان نے رنگ، نسل، زبان یا دولت کی بنیاد پر نوعِ انسانی کے درمیان جو تفریق پیدا کر رکھی ہے وہ سراسر غیر فطری اور باطل ہے انسان بحیثیت انسان احترام اور عزت کا مستحق ہے۔ وہ اگر نیکی اور بھلائی کی راہ پر گامزن ہے تو وہ واجب التعظیم ہے لیکن اگر وہ شر کا علمبردار ہے اور خلق کو اُس کے وجود سے نقصان پہنچتا ہے تو اسے کسی توقیر کا سزاوار نہیں سمجھا جا سکتا۔ انسان نے انسان کی عزت و احترام کا جو مصنوعی اور خود ساختہ معیار قائم کر رکھا ہے وہ سراسر باطل ہے اور اس کا مقصد چند مفاد پرست طبقوں یا قوموں کے مادی مفادات کا تحفظ ہے۔

سونیلانا نے روس کے اندر جس جبر و استبداد اور جس گھٹن کا ذکر کیا ہے یہ کوئی حیرت انگیز انکشافات نہیں۔ تھوڑی سی سمجھ بوجھ رکھنے والا انسان ان کی حقیقت کو خود بخود سمجھ سکتا ہے۔ اشتراکی مصنفین نے سرمایہ دارانہ نظام پر گرفت کرتے ہوئے جس نکتہ پر اپنا سارا زور صرف کیا ہے وہ یہ ہے کہ ذرائع پیدا وار استحصال کا ذریعہ ہیں اور جب یہ افراد کے قبضہ میں ہوں تو وہ ان کی مدد سے غریب عوام پر عرصہ حیات تنگ کر دیتے ہیں۔ ہیرلڈ لاسکی نے اس موضوع پر بڑی تفصیلی بحث کی ہے اور بتایا ہے کہ ایک طرف تو یہ سرمایہ دار افراد مزدوروں اور معاشرے کے کمزور

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

طبقوں کو دل کھول کر لوٹتے ہیں مگر دوسری طرف ان کے سیاسی دباؤ کی وجہ سے یہ کسی کو پھڑپھڑانے اور صدائے احتجاج بلند کرنے کی بھی اجازت نہیں دیتے۔ ملک کا معاشی نظام ان کے مفادات کا محافظ ہوتا ہے بلکہ آئین ان کی تائید اور حمایت کرتا ہے۔ الغرض پورا ملک، پوری آبادی اور اس کے وسائل صرف ان سرمایہ دار طبقوں کے لیے استعمال کیے جاتے ہیں۔

اس تجزیہ میں بلاشبہ بہت کچھ صداقت پائی جاتی ہے۔ لیکن ہمیں یہ سوچنا چاہیے کہ جب چند سرمایہ دار محدود وسائل رکھتے ہوئے کمزور اور بے بس انسانوں کو اپنے ظلم وستم کا جس طرح چاہتے ہیں تختۂ مشق بنا لیتے ہیں تو آخر کیا وجہ ہے کہ پوری مملکت اور اس کے چند سربراہ سارے ملک کے وسائل کو اپنے قبضہ میں لے لینے کے بعد استحصال سے دستکش ہو جائیں گے اور ان کے دل میں سوائے عوام کی خیر اور بھلائی کے اور کوئی خیال جاگزیں نہ ہوگا؟ اگر سرمایہ ایک فرد کے لیے قوت کا ذریعہ بن کر اسے ظلم وستم پر ابھارتا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ پورے ملک کے وسائل پیداوار حکمران گروہ کے ہاتھ میں آکر اسے جابر اور مستبد نہ بنا دیں اور وہ ہر قسم کے خوف سے یکسر بے پروا ہو کر انسانوں پر جس طرح چاہیں اپنی خدائی کا تسلط قائم نہ کریں۔

بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ ذرائع پیداوار پر حکومت کا قبضہ ہونے کی وجہ سے کسی کے کوئی ذاتی مفادات نہ رہیں گے اور اس طرح کسی کے ذہن میں استحصال کا خیال نہ پیدا ہوگا۔ لیکن یہ محض فریب نظر ہے۔ اصل میں انسان جس چیز کا طلبگار رہتا ہے وہ قوت ہے اور چونکہ اسے دولت کے ذریعے معاشرے میں قوت حاصل ہوتی ہے اس لیے وہ اس کے حصول کے لیے ہر جائز و ناجائز کوشش کرتا ہے۔ دولت تو قوت حاصل کرنے کا ایک ذریعہ ہے اور پھر وہ اسی قوت کے بل بوتے پر عوام کی گردنوں پر مسلط ہو کر انہیں اپنی اغراض کے لیے استعمال کرتا ہے۔ مفادات ہمیشہ دولت کی صورت ہی میں نہیں ہوتے بلکہ قوت کی صورت میں سامنے آتے ہیں۔ ظاہر بات ہے کہ اشتراکی مملکت پر سارے عوام تو حکمران نہ ہوں گے بلکہ چند رہنما ہی ہوں گے۔ ان رہنماؤں کا پورے ملک پر قبضہ ہوگا۔ ان حالات میں قوت کے نشہ میں سرشار ہو کر یہ من مانی کارروائیاں بھی کریں گے۔ جب سرمایہ دار تھوڑی سی قوت حاصل ہو

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تفہیم القرآن

الرحمٰن

نام | پہلے ہی لفظ کو اس سورہ کا نام قرار دیا گیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ وہ سورۃ ہے جو لفظ الرحمٰن سے شروع ہوتی ہے۔ تاہم اس نام کو سورۃ کے مضمون سے بھی گہری مناسبت ہے، کیونکہ اس میں شروع سے آخر تک اللہ تعالیٰ کی صفتِ رحمت کے مظاہر و ثمرات کا ذکر فرمایا گیا ہے۔

زمانۂ نزول | علمائے تفسیر بالعموم اس سورۃ کو مکی قرار دیتے ہیں۔ اگرچہ بعض روایات میں حضرت عبداللہ بن عباس اور عکرمہ اور قتادہ سے یہ قول منقول ہے کہ یہ سورۃ مدنی ہے، لیکن اول تو انہی بزرگوں سے بعض دوسری روایات اس کے خلاف بھی منقول ہوتی ہیں، دوسرے اس کا مضمون مدنی سورتوں کی بہ نسبت مکی سورتوں سے زیادہ مشابہ ہے، بلکہ اپنے مضمون کے لحاظ سے یہ مکے کے بھی ابتدائی دور کی معلوم ہوتی ہے۔ اور مزید براں متعدد معتبر روایات سے اس امر کا ثبوت ملتا ہے کہ یہ مکۂ معظمہ ہی میں ہجرت سے کئی سال قبل نازل ہوئی تھی۔

مسند احمد میں حضرت اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہا کی روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حرم میں خانہ کعبہ کے اُس گوشے کی طرف رُخ کر کے نماز پڑھتے دیکھا جس میں حجرِ اسود نصب ہے۔ یہ اُس زمانے کی بات ہے جبکہ ابھی فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ (جس چیز کا تمہیں حکم دیا جا رہا ہے اُسے ہانکے پکارے کہہ دو) کا فرمانِ الٰہی نازل نہیں ہوا تھا۔ مشرکین اس نماز میں آپ کی زبان سے فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ کے الفاظ سن رہے تھے۔" اس سے معلوم ہوا کہ یہ سورۃ سورۂ الحجر سے پہلے نازل ہو چکی تھی۔

© rasailojaraid.com